

روزے کا فلسفہ اور اس کے احکام

شاہ ولی اللہ کے نقطہ نظر سے

حجۃ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مشہور تصنیف حجۃ اللہ البالغہ میں اسلام کے اصولوں اور اس کے اوامر و نواہی کے بعض پہلوؤں پر نہایت عمدہ اور فلسفیانہ بحث کی ہے اور اپنے مخصوص انداز میں ان نکات کو اجاگر کیا ہے جو کسی عمل و فعل کے بارے میں اسلام مقصودِ اصلی ہیں۔ ان میں سے ایک عمل روزہ ہے۔ حضرت شاہ صاحب قدس اللہ سرہ نے اب الصوم میں اس پر بڑی لطیف اور پُر مغز بحث کی ہے۔ ماہِ رمضان کی مناسبت سے ہم اس باب وغریب بحث کے بعض حصوں کا اردو ترجمہ پیش کر رہے ہیں، امید ہے اس کا مطالعہ دلچسپی سے کیا جائے گا۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

بہیمی و حیوانی میلانات و جذبات چوں کہ انسان کو روحانیت اور پاکیزہ وحی کی منزل کی طرف ہٹنے سے روکتے ہیں، اس لیے ضروری ٹھہرا کہ ان کے غلبہ و استیلا کا خاتمہ کیا جائے اور ایسے مواقع اہم کیے جائیں کہ انسانی اقدار کی طرف گام فرسارہ ہے۔ پھر انسانی طبائع پر بہیمیت کی اثر کو بڑھانا باعثِ چوں کہ بہت حد تک اکل و شرب میں غلو اور لذائذِ شہوانیہ میں بے جا انہماک ہے، بنا بریں رعیتِ اسلامی نے لازمی قرار دیا کہ اس جذبے میں کمی پیدا کی جائے اور ان امور میں اعتدال و احتیاط کے تقاضوں کو بہر حال ملحوظِ خاطر رکھا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ انسان میں جذبہٴ روحانیت کے اظہار کے متنبی اور ابھرنے کے خواہاں ہیں، وہ قطع نظر اس کے کہ کس مذہب کے پابند اور کس کے باشندے ہیں، اس بات پر متفق ہیں کہ اخلاقی اقدار کو بلند اور روحانی جذبے کو اونچا کرنے کے لیے تقصیرِ غذا اور تغلیلِ لذائذِ شہوانیہ کے نسخے پر عمل کرنا نہایت ضروری ہے، کیوں کہ یہی وہ رہے جو بہیمیت کی گردن کو ملکیت کے حضور جھکا سکتی ہے اور اسی سے روحانیت کے نعوش انسان، لوحِ قلب پر مرتسم ہو سکتے ہیں۔ یہ چیز اگر کسی خوش نصیب کو حاصل ہو جائے تو وہ بلا کسی ادنیٰ

ہاتھ کے نغزائل دنیوی سے کنارہ کش ہو جاتا ہے اور روحانی تقاضوں کی پاکیزگیاں اس کے اندر جاگزیں ہو جاتی ہیں۔ سرکشی و تمرد کا غلط جذبہ اس کے صفوں میں سے محو ہو جاتا ہے اور بہیمیت کے اوصافِ مذلیلہ سے وہ اپنے آپ کو قطعی پاک و صاف سمجھنے لگتا ہے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ روحانیت اور بہیمیت کے اخلاقیات ایک دوسرے سے بالکل متضاد اور متباہر ہیں، جو چیز جذبہ روحانیت پسندیدہ ہے، بہیمیت اس سے دور بھاگتی ہے، اور جو شئی بہیمیت کو مرغوب و مطلوب ہے، روحانیت اس کو ایک ثانیہ کے لیے بھی لائقِ اعتناء نہیں سمجھتی۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کی کبریائی اور بزرگی کے بارے میں حصولِ معرفت، روحانیت و ملکیت کا ایک خاص موضوع ہے۔ لیکن بہیمیت کو اس سے قطعاً کوئی علاقہ اور واسطہ نہیں۔ سی طرح ایسی چیزوں کا ترک اور ان سے قطع تعلق جو بہیمیت کے لیے باعث کشش ہیں، جن سے جذبہ حیوانیت میں اضافہ ہوتا ہے اور نفسِ نارہ کے تشوقات و میلانات کی راہیں کشادہ ہوتی ہیں، وہ روحانیت کو کسی صورت میں مطلوب نہیں۔

اس حقیقت کے پیش نظر ذرا اس پر غور کیجئے کہ یہ چیز نگاہِ ظاہر میں کے لیے کس قدر تخریب دہک ہے کہ تمام اشیائے اکل و شرب انسان کے سامنے بکھری پڑی ہیں لیکن وہ ان سے قطعی کنارہ کش اور قطعی بے نیاز ہے، کیوں کہ وہ روزے کی حالت میں ہے۔ پھر انسانی طبائع میں چون کہ یہ کم پلو پایا جاتا ہے کہ وہ لذائذِ شہوانی اور تعیشاتِ دنیوی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بُعد نہیں اختیار کر سکتا، کیوں کہ اس کی زندگی کا جو انداز ہے وہ ایسا ہے کہ اس کے سامنے ہوا ہموں اور متنوع چیز ہر وقت باافراط موجود رہتی ہیں۔ لہذا ضروری قرار پایا کہ اس کے اذقات میں سے ایک ایسا وقت متعین کر دیا جائے جب کہ اس کے اکل و شرب پر کچھ قابلِ برداشت پابندیاں عائد ہوں اور کے نفسانی تقاضوں کی تکمیل پر بعض گوارا شرط کا اضافہ ہو۔

تقلیلِ اکل و شرب اور تھمیرِ لذائذِ شہوانی کے دو ہی طریقے ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ بہت کھایا جائے، دوسرے یہ کہ روزانہ کے مقررہ نظام سے دیر کر کے لذتِ کام و دہن میں مشغول ہو جائے۔ شریعتِ اسلامی کے نزدیک دوسرا انداز زیادہ معقول اور لائقِ عمل ہے۔ اس لیے کہ اس انسان کے ضعف و اضمحلال میں اضافہ ہوتا ہے اور جسم کا ہر عضو ایک طرح کی تکان اور کمزوری سے

کتاب ہے، جیسے جیسے بھوک اور پیاس کی شدت کا احساس تیز ہوتا جاتا ہے، عالم ہیئت میں خوف و ڈر اور پریشانی و حیرانی پھیلتی جاتی ہے۔ اور اگر تغذیہ کے پہلے طریقے پر عمل کیا جائے، یعنی خورد و نوش کی مقدار میں تو کمی کر دی جائے لیکن وقت کا کوئی تعین نہ کیا جائے تو اس سے صرف یہ ہوگا کہ انسانی جسم میں ضعف، و نفاہت بڑھے گی اور نفسِ امّارہ اس کو کوئی ہیئت نہ دے گا، اگرچہ وہ اس سے کتنا ہی متاثر کیوں نہ ہو۔ علاوہ انہیں سب لوگوں کو اس پر پابندی عمل کا مکلف نہیں ٹھہرایا جاسکتا، کیوں کہ لوگوں کی مقدار اکل و شرب میں نمایاں تفاوت ہوتا ہے، کسی کی خوراک کم ہوتی ہے کسی کی زیادہ۔ اس سے اس بات کا امکان رہتا ہے کہ ایک شخص کی مقدارِ غذا کا استعمال دوسرے کے لیے باعثِ ہلاکت ثابت ہو جائے۔ مثلاً ایک آدمی پانچ بھر کھاتا ہے اور دوسرا پیر بھر۔ اظہار ہے، اگر ان کو اس پر مجبور کیا جائے کہ وہ اپنی روزانہ کی خوراک میں اس طرح کمی کریں کہ اسی بھر کھانے والا ایک چھٹانک پر گزر کرے، اور سیر بھر کھانے والا آدھ پاؤ پر آجائے تو اس سے ہیئتِ خدیب نہیں ہوگی بلکہ یہ ہوگا کہ ان کی مقدارِ غذا میں انتہائی قلت کی وجہ سے عدم اعتدال پیدا ہو جائے گا اور یہ بات ان کی موت و ہلاکت پر منتج ہوگی۔ اس لیے شریعت نے تغذیہ کی اس پہلی نشی کو لائق التفات ہی نہیں گردانا۔ بہر کیف مقدارِ غذا کے تعین کو لوگوں کی اپنی صواب دید پر چھوڑ دینے سے وہ نتائج برآمد نہیں ہوں گے جو شریعت کو مصلوب ہیں۔

یہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ جب شریعت کو روحانیت و ملکیت کے مقابلے میں ہیئت کو شکست دینا ہی مقصود ہے تو یہ مقصد اس طرح بھی حاصل ہو سکتا ہے کہ انسان ایک دن میں اگر دو وقت کھانا کھاتا ہے تو ایک وقت پر آجائے۔ یا یہ عہد کر لے کہ تین روز میں چھ وقت کھانے کے بجائے دو وقت کھانے پر ہی اکتفا کرے گا اور متواتر دو ہفتے تک اسی کو اپنا معمول ٹھہرائے رکھے گا۔

بات یہ ہے کہ اس سے بھی مقصدِ اصلی حاصل نہیں ہو سکے گا، کیوں کہ شریعت کا منشا انسان کو خواہ مخواہ تکلفات میں ڈالنا نہیں ہے بلکہ اس کی اس نوج سے تربیت کرنا ہے کہ اس میں ہیئت کو مغلوب کرنے کی صلاحیتیں نشوونما پائیں، اور یہ اسی طرح ممکن ہے کہ انسان تغذیہ اور تفصیر لہذا شہوانی کی مشق و تمرین کرے۔ جتنے میں ایک یا دو روز یا سال بھر میں ایک دو ہفتوں سے یہ مدعا حاصل نہیں ہو سکتا اور اس کی اثر انگیزیوں میں وسعت نہیں پیدا ہو سکتی۔ نہ یہ اسی طرح

مکڑا ہے کہ اس عمل کو دو دو مہینے تک تمتد کر دیا جائے، کیوں کہ اس سے بعض صورتوں میں غصہ ہے کہ انسان کے قوائے عمل پر خیر معمولی ضعف و کمزوری محیط ہو جائے اور یہ شریعت کو مطلوب نہیں۔ مثلاً شدید گرمی کے موسم میں اس کا برداشت کرنا اعلاظہ امکان سے باہر ہے۔ اس لیے ہجر اور فطری صورت ہی تھی کہ اس کے لیے سال بھر میں ایک مہینے کا تعین کر دیا جاتا اور وہ ہمیشہ قنوی حساب سے ہوتا تاکہ موسم میں تبدیلی پیدا ہوتی رہے۔ کبھی کوئی موسم آگیا اور کبھی کوئی۔! روزے کے سلسلے میں یہ سوال بھی کیا جاسکتا ہے کہ اگر شریعت کو سال بھر میں ایک مہینہ ہی مقرر کرنا تھا تو خود لوگوں کو یہ اختیار کیوں نہیں دے دیا گیا کہ اپنی مرضی سے جو شخص جو مہینہ چاہے منتخب کر لے۔ یہ اختیار انسان سے شریعت نے سلب کر کے اس کو اپنے جائزہ حق سے کیوں محروم کر دیا؟ نیز روزے کے لیے رمضان ہی کا مہینہ کس بنا پر منتخب کیا گیا؟ کوئی اور مہینہ اس کے لیے موزوں نہیں ہو سکتا تھا۔؟

بات درحقیقت یہ ہے کہ شریعت اسلامیہ اجتماعیت کی قائل ہے۔ اس میں جو مقام درمقام اور جو انضلیت و شرف اجتماعیت کو حاصل ہے، وہ انفرادیت کو ہرگز حاصل نہیں۔! مثلاً اگر یہ ہونا کہ لوگوں کو ان کی صواب دید پر چھوڑ دیا جاتا تاکہ وہ روزے کے لیے سال بھر میں جو چاہے مہینہ منتخب کر لیں تو اس سے اجتماعیت ختم ہو جاتی۔ یعنی یہ ہوتا کہ کوئی شخص جاٹوں میں روزے رکھنا شروع کر دیتا اور کوئی بوسم لگتا۔! اس سے وحدتِ عمل کا خاتمہ ہو جاتا۔ سب کے لیے ایک ہی مہینے کے تعین میں اصل باعث یہ ہے کہ شرق و غرب اور جنوب و شمال کے مسلمانوں میں یہ نظم پایا جائے کہ وہ ایک ہی مہینے میں یہ اہم فرض انجام دیں گے۔ اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ لوگوں میں یکساں دوسرے کو دیکھ کر استغناء عمل بڑھتی ہے، نیکی کا جذبہ بیدار ہوتا ہے، بھوک پیاس کی شدت میں کمی کا احساس پیدا ہوتا ہے، ایک کو دیکھنے سے دوسرے کی ڈھارس بندھتی ہے۔! رمضان کے مہینے کا تعین، تو یہ اس لیے کیا گیا کہ جب سال میں کسی مہینے کو یہ شرف تعین حاصل ہونا ہی تو تھا تو کیوں اس کے لیے رمضان المبارک ہی کو منتخب نہ کیا جاتا۔ اس لیے کہ یہ وہ مہینہ ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہوا۔ اس میں لیلۃ القدر واقع ہے جو بکتول اور ساداتوں کا مجموعہ ہے، اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس میں بے شمار دینی فوائد حاصل ہوئے، گویا اسلام کی ایک پوری

تاریخ اس سے وابستہ ہے۔

یہاں یہ وضاحت کر دینا بھی ضروری ہے کہ وہ کون منزل ہے، جس کو عبور کیے بغیر کوئی شخص روحاً کے مقام علیا پر فائز نہیں ہو سکتا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے موقوفہ فرائض سے عمدہ برآ ہونا اس کے بس سے باہر ہوتا ہے۔

اس کی پہلی منزل یہ ہے کہ انسان نماز و حج گاندہ پابندی سے ادا کرے، سال بھر رمضان کے بھنے رکھے، فجر اور عشا کی نماز باخصوص باجماعت پڑھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی رو سے اس کا اجر قیام اللیل کے مترادف ہے۔ روزے میں اس کی تمام کیفیات کو قلب و نظر کے زاویوں میں لائے اور اس کے سبب ارکان کی ادائیگی کا پورا اہتمام کرے۔ مثال کے طور پر قیام اللیل کو معمول ٹھہرائے، کھانے پینے اور ناشائستہ حرکات سے محفوظ رکھے۔ عید الفطر کے بعد شوال کے چھ روزے التزام سے رکھے، عرفہ اور عاشورہ کے روزے تھانہ ہونے دے، رمضان کے عشرہ آخر میں احکامات کی حیثیت اس باب میں تمسید و توطیہ کی ہے۔

روزے سے متعلق احادیث کی تشریح

اب ان چند احادیث کی تشریح پر نظر ڈالیے جو روزے سے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

إِذَا دَخَلَ رَمَضَانَ فَتَحَّتْ أَبْوَابُ الْجَنَّةِ (وفی روایتہ أَبْوَابُ الرَّحْمَةِ) وَغُلِقَتْ
أَبْوَابُ جَهَنَّمَ وَسُلِسَتْ الشَّيَاطِينُ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جب رمضان کا مہینہ شروع ہوتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں (ایک روایت میں ہے رحمت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں) دوزخ کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں اور شیطان زنجیروں میں جکڑ دیے جاتے ہیں۔

رمضان المبارک میں ابواب جہنم یا ابواب رحمت کا کھلنا، ابواب جہنم کا بند ہو جانا اور شیاطین کو پابہ زنجیر کر دینا مسلمان کے لیے خاص ہے، کفر و طغیان میں مستغرق لوگوں سے اس کا کوئی تعلق

نہیں۔ کیوں کہ یہ لوگ اپنی عادتِ مستمرہ کے مطابق جب بد عملی اور بد کرداری کا ارتکاب کرتے ہیں تو اس کی وجہ سے ان کے نامہ اعمال پر رمضان میں معصیت و تہرہ کے مزید دھبہ پڑ جاتے ہیں، لیکن جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرماں برداری سے مستغنی ہوئے ہیں، وہ دن کو روزہ رکھنے اور شب کو اللہ کے حضور قیام کرتے ہیں۔ اس سے بہ حساب مراتب و استعداد ان کی نیکیوں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور ان کے اعمالِ حسنہ کے مجموعی پھیلاؤ کے باعث معصیت میں کمی پیدا ہو جاتی ہے، بلکہ شیطان کو اپنے غم و ارادہ میں بہم ہر ہمتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے یعنی شیطان روزے طرک کے غم و تہمت کے مقابلے میں بے بس ہو جاتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی شر ایگزٹو فریوئیں میں کمی واقع ہو جاتی ہے اور روزے دار کے لیے جنت کے دروازے داہو جاتے ہیں۔ مگر اس کے گرد ہجوم کر لیتے ہیں، جس کے نتیجے میں اس کے قلب و ذہن سے بسیمیت و سرکشی کے جذبات کم ہو جاتے ہیں، اور ہر طرف انوار و فیوض کی ایک دل نواز اور روح پرور کیفیت جلو گر ہو جاتی ہے، اور یہی وہ شے ہے جس کے سامنے شیطاں شکست کھا جاتے ہیں اور اس و نا امیدی سے میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ پس یہی وہ کیفیت ہے جو عبادت ہے، شیطاں کے زنجیروں میں جکڑے جانے اور روزے دار کے لیے جنت و رحمت کے دروازے کھل جانے سے۔

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **مَنْ صَامَ رَمَضَانَ إِيمَانًا وَ اِحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ**۔

جس شخص نے تقاضائے ایمان کے تحت اور طلبِ ثواب کی نیت سے رمضان کے روزے رکھے اس کے پچھلے گناہوں کی اللہ تعالیٰ مغفرت فرمادیتا ہے۔

پورے ماہ رمضان کے روزے رکھ لینے سے یہ امید ابھر آتی ہے کہ روزے سے دار میں روحانیت و ملکیت کا جو ہر جھک اٹھے اور اس کے ذریعہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی میں کامیاب ہو جائے، اس کا ابر و رحمت اس پر چھا جائے اور وہ اس کی مسلسل بارش سے معصیت و گناہ سے پاک ہو جائے اور اس کو جن غلط کیفیات نے گھیر رکھا ہے، اس کے برعکس اب صحیح کیفیات اس کے روح و جسم پر جاری و ساری ہو جائیں۔

دوسری حدیث میں آنحضرت فرماتے ہیں: **مَنْ قَامَ لَيْلَةَ الْقَدْرِ اِيْمَانًا وَ اِحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ**۔

یعنی جس شخص نے ایمان کے تقاضے کے پیش نظر اور طلبِ ثواب کی نیت سے ایسا القدر میں قیام کیا، اس کے پچھلے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

اس میں یہ حکمت پنہاں ہے کہ عبادت اگر ایسے وقت میں کی جائے جب کہ پوری دنیا پر روحانیت و پاکیزہ دہشی کا دور دورہ ہو، اور انسان پر ایسا مثالی کیفیت طاری ہو تو وہ عبادتِ قلب کی گہرائی میں آکر جاتی ہے اور جسم کا ہر گوشہ اور روح کی ہر تہہ اس سے متاثر و منفعل ہوتی ہے۔ اور اسی ساعتِ سیدگی وہ عبادت سے جو آگ پر کھڑی ہو، لیکن اثر انگیزی میں وہ لطف پیدا کرتی ہے جو دوسرے اوقات کی اس سے کئی گنا زیادہ عبادت بھی نہیں کر پاتی۔ یہی مطلب ہے اس حدیث کا جس میں آتا ہے:

قَالَ عَلِيُّ بْنُ أَبِي تَمِيمَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ لَمَّا سَأَلْتُهُ عَنْ بَيْتِهَا الْحَقِّ سَبْعِينَ مَرَّةً وَفِيهِ، قَالَ: اللَّهُ تَعَالَى إِذَا الْعَبْدُ قَامَ لِي وَانَا أَجْزِي بِهِ يَنْعَمُ شَهْوَةً وَطَعْمًا مِمَّا دَسَّرَابَهُ مِنْ بَيْتِي۔

یعنی ہر نیکی کا اجر کئی گنا زیادہ ملتا ہے، یہاں تک کہ بعض نیکیوں کا اجر سات سو گنا تک جا پہنچتا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرما ہے کہ روزہ ان اعداد و شمار سے مستثنیٰ ہے، وہ خالص میرے لیے ہے اور اس کے اجر کا مقدر خود میں ہی منتخب کروں گا۔ کیوں کہ روزہ دار اپنے کھانے پینے اور خواہشاتِ نفسانی کو میرے ہی لیے ترک کرتا ہے۔ بات یہ ہے کہ جب انسان ماسوی اللہ سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور اپنے قلب و ضمیر کا تعلق اللہ تعالیٰ سے وابستہ کر لیتا ہے تو اس کی روحانیت جاگ اٹھتی ہے اور وہ تمام علائقِ نفسانی سے متبرہ و متفرق ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے اس حالت میں وہ جو عبادت بھی کرے گا پورے اطمینانِ قلب اور کامل یکتا ہوتی سے کرے گا، اور اس کے درجات و مراتب میں برابر اضافہ ہوتا جائے گا۔

روزے کو مقدارِ اجر کی تعیین سے اس بنا پر مستثنیٰ کیا گیا ہے کہ وہ فقط اللہ کی رضا جوئی کے لیے رکھا جاتا ہے اور انسانِ خلیل میں و دیانت کے تمام لوازم کے ساتھ اس کو نبھاتا ہے، اس لیے ضروری ٹھہرا کہ اس کے اجر و ثواب کی راہ میں اندازہ و مقدار کی تعیین کا پیمانہ حاصل نہ ہو اور اس کا تعلق بلکہ راست اللہ سے رہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

حدیث میں آتا ہے:

لِلصَّائِمِ فَرْحَتَانِ، فَرْحَةٌ عِنْدَ فِطْرِهِ وَفَرْحَةٌ عِنْدَ لِقَائِ رَبِّهِ۔

روزے دار کے لیے دو مرتبے ہیں، ایک مسرت تو اسے روزہ انعام کرنے کے وقت حاصل ہوتی ہے اور دوسری مسرت اپنے رب سے ملاقات کے وقت حاصل ہوتی۔
 پہلی قسم کی مسرت تو بالکل فطری اور طبی ہے، کیوں کہ جو شخص اپنے مغلوب و مغلوبہ کے حصول میں کامیاب ہو جاتا ہے وہ یقیناً مسرت و شادمانی کی دو نواں سے ہم کنار ہوتا ہے، اس کی طبیعت خوش ہوتی ہے اور قلب میں بہیمیت و انبساط کی بے پایاں لہر دوڑ جاتی ہے۔ دوسری خوشی کا تعلق برکت و ملکیت سے ہے۔ روزے کی حالت میں انسان چوں کہ مادی ملاحظے سے کنارہ کش ہو جاتا ہے اور اس کی وابستگی اللہ کے ساتھ مختص ہو جاتی ہے، اس لیے ظاہر ہے اس عبادتِ اقدس سے ملاقات کے وقت خوشی ہونی ہی چاہیے۔ کیوں اسی غرض سے تو اس نے سب چیزوں کو ترک کیا ہے اور بہیمیت و سبذیت کو مغلوب کر کے اپنی اطاعت کیشیوں کا مرکز یعنی اللہ کو قرار دیا ہے۔

ایک اور حدیث میں آتا ہے:

لَمْ يَكُفْ نَهْرُ الْقَائِمِ أَطْيَبَ صِدْقًا لِلَّهِ مِنْ رِيحِ الْمَسْكِ

کہ دن بھر بھوکا پایا سا رہنے کی وجہ سے (روزے دار کے منہ میں جو بو پیدا ہو جاتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے بھی زیادہ پسندیدہ ہے۔

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کے نزدیک روزے کی عبادت کو خاص درجہ حاصل ہے، اسی طرح اس کے اثرات و نتائج بھی اس کے نزدیک محبوب و مقبول ہیں اور عالم مثال میں اس کا تمثیل بعینہم جلالت کا درجہ رکھتا ہے۔

دوسری جگہ آنحضرت کا فرمان ہے: **الْعِتْيَا مَجْتَنَةٌ**

کہ روزہ انسان کے لیے بڑائی سے ڈھال کا درجہ رکھتا ہے۔

یعنی جس طرح ڈھال آدمی کو دشمن کے وار سے محفوظ رکھتی ہے، ٹھیک اسی طرح عتیا بھی اپنے

کو نفسِ امارہ سے مصون اور شیطان کے شر سے مامون رکھتا ہے، اور یہ اس کی حفاظت و عصیان کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اسی بنا پر روزے دار کے لیے یہ ضروری قرار دیا گیا کہ نہ زبان کو براہ گوئی اور

اعضا و جوارح کو ناشائستہ حرکات کے صدور سے بچا کر رکھے۔ حتیٰ کہ (جیسا کہ حدیث میں آتا ہے) اگر کوئی شخص روزے دار کو غش کلامی اور بد تمیزی سے پیش آئے تو اس کے مقابلے میں بھی دائرۃ

تہذیب سے باہر قدم نہ نکلنے اور زبان کو بدکلامی سے پاک رکھے اور کہے :

إِنِّي صَائِمٌ

میں روزے سے ہوں۔

لہذا اپنے جذبات کو بے قابو نہیں ہونے دوں گا۔

اسلام سے پہلے بھی روزے کا رواج تھا اور بطور عبادت کے لوگ روزہ رکھتے تھے۔ لیکن اس کو امتوں نے تکلیف دہ مجاہدہ اور نفس کشی کا ذریعہ بنا رکھا تھا۔ نفس کو مغلوب و مقہور رکھنے کے لیے اس میں بہت سی بدعات و خرافات کو ڈھیل کر لیا تھا۔ اسلام چوں کہ فطری مذہب ہے اور انسانی طبیعت کے عین مطابق ہے، لہذا رہبانیت اور تعق سے اس کو کوئی واسطہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے ہر قسم کی بدعات و خرافات کے ارتکاب سے سختی کے ساتھ روک دیا، یہاں تک کہ رمضان کا چاند ہونے سے ایک روز پہلے روزہ رکھنے سے بھی شریعت نے منع فرما دیا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

لَا يَتَقَدَّرُ مِنْ أَحَدِكُمْ مِنْ رَمَضَانَ بِعُزْمٍ يَوْمًا أَوْ يَوْمَيْنِ إِلَّا أَنْ يَكُونَ رَجُلًا
كَانَ يَصُومُ فَيُصُومُ ذَٰلِكَ الْيَوْمَ۔

کوئی شخص رمضان سے ایک یا دو دن پہلے روزہ نہ رکھے۔ البتہ یہ الگ بات ہے کہ کسی شخص کی روزہ رکھنے کی عادت ہو، اور اتفاق سے وہ دن رمضان سے ایک دن پہلے آتا ہو۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شکر اور عید کے دن کا روزہ رکھنے سے بھی روک دیا۔ کیوں کہ اس طرح کی ڈھیل سے خطرہ ہے کہ آٹھ والی نسیم اس میں مزید اختراعات کر لیں گی، اور تکلف و تعق اور رہبانیت کے اعتبار سے وہی پہلی امتوں کی عادات و اطوار امت محمدیہ میں بھی آجائیں گی۔ اسی بنا پر شریعت نے سحری کو ضروری اور باعث برکت قرار دیا ہے اور آنحضرتؐ نے فرمایا ہے :

تَسْتَعْرِضُوا فَإِنَّ فِي السَّحُورِ بَرَكَاتًا

سحری کیا کرو، سحری میں برکت ہے۔

روزے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ روح کو اس طرح بالیدگی سمیٹا کی جائے کہ جسم کی کمزوری اور نفاہت آخری نقطے تک پہنچ جائے۔ بلکہ مقصد، روح و جسم دونوں کو ترقی دہانگی بخشنا، آرام و آسائش سمیٹا کر نا

اور تکلیف بالا اطلاق سے محفوظ رکھنا ہے۔ اسی لیے حدیث قدسی میں افطار کے لیے عجلت کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ آنحضرت کی زبانی اللہ کا فرمان ہے:

أَحَبُّ عِبَادِي أَجَلُهُمْ فِطْرًا۔

میرے سب سے محبوب بندے وہ ہیں جو روزہ افطار کرنے میں عجلت سے کام لیتے ہیں۔

دوسری جگہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لَا يَذَالُ النَّاسُ بِمَخْيَرٍ مَا تَجَلَّى الْفِطْرَ۔

جب تک لوگ روزہ افطار کرنے میں عجلت کرتے رہیں گے، نیکی پر رہیں گے۔

شریعت نے روزے کے وصال، یعنی رات دن کا اٹھنا روزہ رکھنے سے بھی منع فرمایا ہے کہ لوگ

تکلیف سے بچے رہیں۔ رسول اکرم کا ارشاد ہے:

فَضْلٌ مَا بَيْنَ صِيَامِنَا وَصِيَامِ أَهْلِ الْكِتَابِ أَكْثَرُ الشَّخْرِ۔

ہمارے اور اہل کتاب کے روزے میں سحری کھلنے کا فرق ہے۔

اسلام کو چوں کہ روزے کے بارے میں رہبانیت اور تکلف و تمقن کا سدباب کرنا مقصود تھا، اس

لیے اس نے سفر کی حالت میں بھی ترکِ روزہ کی اجازت مرحمت فرمادی، بلکہ بعض مواقع پر تو مسافر

سے سخت الفاظ میں کہا ہے کہ اس رعایت سے ضرور فائدہ اٹھائے اور روزہ بہر حال ترک کرے۔ واضح

لفظوں میں فرمایا:

لَيْسَ مِنْ الْبِرِّ الصِّيَامُ فِي الشَّفْرِ، فَهَبَّ الْمُعْطَرُونَ بِالْأَجْرِ۔

حالتِ سفر میں روزہ رکھنا نیکی نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ سفر میں غیر روزہ دانہ اجر و ثواب کے

مستحق قرار پاگئے۔

اگر روزے سے شریعت کا مقصد محض انسان کو تنگ کرنا اور بھوکا پیاسا رکھنا ہوتا، اس کے

پچھے روحانیت کا کوئی جذبہ اور ملکوتیت کا کوئی وسیعہ کا فرمانہ ہوتا تو سفر میں روزے سے نہرگز منع نہ

کیا جاتا، بلکہ اس کو زیادہ مروجِ اجراء و باعثِ ثواب گردانا جاتا، لیکن ایسا نہیں ہے۔ اسلام نے

روح اور جسم دونوں کی توانائی اور بالیدگی کا خیال رکھا ہے۔

رمضان کا آخری عشرہ

اب رمضان المبارک کے آخری عشرہ کی طرف آئیے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے دو ایسی چیزیں روایت

فرمائی ہیں، جو انوارِ برکات سے بھر پور ہیں، ایک لیلۃ القدر اور دوسرے اعتکاف۔
 لیلۃ القدر وہ مبارک و مقدس رات ہے کہ جس میں ملائکہ صفوہ ارض پر اترتے اور اس پر
 روحانیت و ملکوتیت کے جوہر نچا اور کرتے ہیں۔ ان کے انعکاس سے اہل دنیا پر ایک عجیب قسم
 کی روحانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، اس کے فیوض و انوار کی خیا پاشیوں سے ملائکہ مرد مومن
 کے قریب آتے ہیں، اور شیطان متوحش و بالوس ہو کر دور بھاگتے ہیں۔

اس متبرک و مقدس رات کی عبادت کو اللہ کے نزدیک بے پناہ شرف و فضیلت حاصل ہے۔
 یہ رات جیسا کہ حدیث میں آتا ہے، رمضان کے آخری عشرہ میں طاق راتوں میں آتی ہے جس
 بلند بخت اور خوش نصیب شخص نے اس رات کو پالیا، وہ روحانیت و ملکوتیت کے خزانہ فیض
 سے سیراب ہو گیا۔

رہا اعتکاف، تو یہ درحقیقت لیلۃ القدر ہی کے حصول کا ایک مؤثر ذریعہ ہے، اور اسی بنا پر
 اسے رمضان کے آخری عشرہ میں شروع ٹھہرایا گیا ہے۔ جب بندہ مومن اعتکاف کی غرض سے مسجد میں
 بیٹھ جاتا ہے اور فراغِ خاطر اور صفائے قلب کے لیے ہمت تن تیار ہو کر میدانِ عمل میں اُتر آتا ہے
 تو اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اس کا احاطہ کر لیتی ہیں اور اس کا ایڑ کریم اس کو محیط ہو جاتا ہے۔
 اعتکاف میں ایک حکمت یہ بھی نہاں ہے کہ جب بندہ عطا فی دنیوی سے الگ ہو کر گوشہٴ مسجد میں
 چلا جاتا اور مافاتِ نفس کو ترک کر دیتا ہے تو لازماً اس میں عبادت کے لیے رغبت بڑھ جاتی ہے
 اور نیکی کا شوق دل میں کروٹ لینے لگتا ہے۔

(لغیہ نقد و نظر)

”امیر العلماء ہیں۔“ رئیس المصنفین ہیں۔ ان کا وجود علم و فضل کا ایک دریا ہے۔ وہ صاحبِ نظر ہیں
 لکھتے ہیں؟ علومِ اسلام کی جوئے شیر کا فریاد آج ہندوستان میں سوائے سید سلیمان ندوی کے اور کون ہے؟
 اقبال، سید سلیمان ندوی کے مشیر علمی سے خوب آگاہ تھے۔ وہ ان کے نام اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:
 ”مگر میری نظر اس قدر وسیع ہوتی جس قدر آپ کی ہے تو مجھ یقین ہے کہ میں اسلام کی کچھ خدمت کر سکتا۔“ (ص ۲۸)
 ”اقبال اور سید سلیمان ندوی“ رجالِ اقبال کے سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ ظاہر تو نسوی صاحب نے
 یہ کتاب لکھ کر ایک علمی خدمت انجام دی ہے۔